مغربی مادیت کے مآخذ

مریم جمیلہ (امریکن نومسلمہ)

(ترجمہ : عثمان غنی)

مذہبی اصولوں کی تفصیلات میں واضح اختلافات اور نمایاں سیاسی رقابت کے باوجود قرونِ وسطیٰ کے مسیحی یورپ اور مسلمان دنیا میں ایک بنیادی قدرِ مشترک پائی جاتی تھی۔ اُس وقت مسلمانوں اور نصرانیوں دونوں کے فکر کا مرکز اخروی فلاح تھی مسلمان بھی اور عیسائی بھی یہ تسلیم کرتے رہے کہ پیغمبروں کے ذریعے مقدس اور الہامی کتابوں میں جو اخلاقی قدریں اللہ تعالیٰ نے بتائی ہیں وہ مستقل اور ابدی ہیں۔ کسی کو اس بارے میں شک نہ تھا کہ خدائی احکام کے مقابلے میں بغاوت کے نتائج ناقابلِ بیان حد تک ہولناک ہوں گے۔ اس دنیا کی زندگی میں برضا و رغبت اللہ تعالیٰ کی مرضی کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دینا ہر کسی کے نزدیک دوسری دنیا میں لازوال نعمتوں کی یقینی ضمانت تھا۔

قرونِ وسطیٰ کی مسیحی اور مسلمان دنیا میں سارے اعتقادی اختلافات سے بالاتر ہو کر مشترک مذہبی قدریں آزادانہ تہذیبی تبادلوں کے ذریعے نافذ کی گئیں۔ سپین میں بڑی خونناک لڑائیاں بھی ہوئیں، مگر وہ بھی ہزاروں عیسائی علماء کو قرطبہ، غرناطہ اور شمالی افریقہ کی عظیم مسلمان یونیورسٹیوں میں شرکت اور ان سے استفادہ سے روک نہ سکیں۔ پادری سلوسٹر (SYLVESTER) نے، جو یورپ میں صفر، اعشاریہ اور دوسرے عربی اعداد متعارف کرانے والا ہے، قرطبہ یونیورسٹی میں تعلیم پائی تھی۔ مسلمان مفکرین نے بھی اور عیسائی فلسفیوں نے بھی اپنے اپنے نظریات کو ارسطو کی منطق سے قوت پہنچانے کی کوشش کی۔ یہ کوئی محض اتفاق نہیں کہ وہی تھامس اکوئیناس (ST. THOMAS ACQUIN) جو اپنی تحریروں میں اسلام پر زوردار حملے کرتا ہے، ابن سینا، غزالی اور ابن رشد کا نہایت مشتاق طالب علم تھا۔ یہ تاریخی پس منظر ذہن میں رکھا جائے تو اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں رہ جاتی کہ دانتے (DANTE)

کے " ملکوتی طربیہ" اور ابن العربی کے بیانِ معراج نبویؐ میں اتنی واضح مماثلت پائی جاتی ہے۔ عیسائی ولی فرانسس اسیسی (FRANCIS ASSISSI) اور عظیم صوفی شاعر ابن الفرید کی گہری ذاتی دوستی شاید اُس روحانی تعلق کا بہترین مظہر ہے جو قرونِ وسطیٰ کے مسیحی یورپ اور اس وقت کی مسلمان دنیا میں پایا جاتا تھا۔

یورپ میں نشاۃ ثانیہ کا آغاز ہوا تو اُس کی اور مسلمان دنیا کی ذہنی و نظری فضا میں بُعد برابر بڑھتا گیا۔ شہروں میں اضافے اور تجارت کے پھیلاؤ کی وجہ سے شہری معاشرہ میں ایک ایسا غالب درمیانی طبقہ پیدا ہوتا گیا جس نے کلیسا اور پادری کو پیچھے دھکیل دیا۔ مضبوط مرکزی حکومتوں کی مدد سے تیار کردہ فوجوں نے جاگیرداروں کے خلاف بغاوت کر کے ان کی جائدادیں ضبط کرلیں۔ پادریوں کے بجائے علوم و فنون کی سرپرستی تاجر، ساہوکار اور بادشاہ کرنے لگے۔ جب آخرت سے قطع نظر کر کے اسی دنیا میں ہر فرد کی ساری صلاحیتوں کے ہر جائز و ناجائز طریقے سے ارتقاء پر پورا زور دیا جانے لگا تو اس وقت اُس جدید مغربی تہذیب نے جنم لیا جسے آج ہم اس کی موجودہ شکل میں دیکھ رہے ہیں

بڑی گرمجوشی کے ساتھ نشاۃ ثانیہ کے علماء نے یونان اور روم کے قدیم لٹریچر کی طرف رجوع کیا۔ اب چونکہ خدا کے بجائے مطلق انسانی فہم و فراست پر ایمان لایا گیا تھا اس لیے نشاۃ ثانیہ کے علماء نے کلیسا سے روحانی تعلقات منقطع کر کے مادہ پرستانہ اور کافرانہ فلسفوں سے رشتہ جوڑنے میں اپنے آپ کو حق بجانب پایا۔ قرونِ وسطیٰ میں مثالی تصور کی جانے والی خانقاہی زندگی کا مذاق اڑایا گیا اور اس پر پھبتیاں چست کی گئیں۔ دنیا پرستی اور دولت نے خود کلیسا کو بہت بگاڑ دیا حتیٰ کہ حالت یہ ہوگئی کہ بعض پادریوں اور راہبوں کے عیاشانہ ماحول میں اور بے دین شہنشاہوں کے ایوانوں میں کوئی فرق باقی نہ رہ گیا۔

پروٹسٹنٹ تحریکِ اصلاحِ مذہب نے کلیسا پر ایسی کاری ضرب لگائی کہ اس کے بعد وہ آج تک جانبر نہ ہوسکا۔ مارٹن لوتھر نے کلیسا کی خرابیاں دور کرنے پر اکتفا نہ کیا بلکہ اسے بالکل ختم کر کے اپنا ایک نیا مذہب ایجاد کرنے کا اُس نے تہیہ کرلیا۔ حقیقت یہ ہے کہ رومن چرچ میں اتنا فساد

اور لگاڑ نہیں پیدا ہوا تھا جتنا عام طور پر سمجھا جاتا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ دولت میں فراوانی کے ساتھ جرمنی کا کاروباری طبقہ دن بدن راہبانہ نظریۂ زندگی اور روم کی روحانی برتری کے زیادہ سے زیادہ خلاف ہوتا چلا گیا۔ انہوں نے اس بات کا پرچار کیا کہ دنیوی ترقی اور مادی خوشحالی خدا کی خوشنودی کی محسوس علامتیں ہیں اور غربت اس کا عذاب ہے۔ اس طبقے نے خلوت کو خود غرضی اور مراقبوں اور فکر کو بیکاری اور کاہلی سے تعبیر کیا۔ مارٹن لوتھر نے پوپ کے اختیارات کے خلاف جو بغاوت کی اور اس کے منصب اور خانقاہی زندگی کے خاتمے کے لیے جو کوشش کی، اس سے بہت سے مسلمان مفکرین یہ سمجھتے ہیں کہ پروٹسٹنٹ نظریات اس بات کا ثبوت ہیں کہ عیسائیت ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی اسلام کے قریب آرہی ہے۔ لیکن گہرا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ رجائیت حق بجانب نہیں۔ پادریوں کا اقتدار ختم کرکے جب صرف الہامی کتاب کو سند قرار دیا گیا تو اس سے ہر فرد بشر کو کھلی چھٹی مل گئی کہ وہ مسیحی روایات کو نظر انداز کرکے بائبل کی من مانی تعبیر و تاویل کرے اور اپنی مرضی اور سہولت کے پیش نظر اس میں سے جس چیز کو چاہے قبول کرلے اور جس چیز کو چاہے رد کردے۔ پروٹسٹنٹ رہنماؤں نے لاطینی زبان کی اہمیت سے انکار کرکے انجیل کا مقامی زبانوں میں ترجمہ کیا اور اس سے بائبل میں مزید تحریفیں ہوئیں۔ اس طرح پوپ کے منصب اور لاطینی زبان کی اہمیت سے انکار نے لادینی قومیت کے نظریہ کو بڑی تقویت پہنچائی۔ تمام پروٹسٹنٹ ممالک میں علیحدہ قومی کلیسا حکومت کے مکمل کنٹرول کے تحت منظم کیے گئے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ یورپ میں ہر جگہ مذہب کی روحانی قوت لادینی سیاست کے مفاد کو آگے بڑھانے کے لیے استعمال کی گئی۔

مضبوط متحد عیسائیت کے بجائے اب ایسے چھوٹے چھوٹے اور کمزور کمزور مجتمعات معرض وجود میں آگئے جن کے اپنے اپنے محدود، مقامی اور تنگ نقطہ ہائے نظر تھے۔ پروٹسٹنٹ مذہب نے نجات کو خالصتہً خدا کے عطا کردہ عقائد کا کرشمہ بتایا اور یہ سکھایا کہ فلاح کا فرد کے اخلاقی معیار اور نیک اعمال کے ساتھ قطعاً کوئی تعلق نہیں۔ اب اخلاقی قدروں کا خدا کی رضا اور حکم کے ساتھ

کوئی رشتہ نہ رہا۔ مارٹن لوتھر کے متبعین آزاد تھے کہ خدا و آخرت سے بے نیاز ہو کر جیسے چاہیں زندگی گزاریں۔ پروٹسٹنٹ نقطۂ نظر یہ تھا کہ مذہب کلی طور پر پرائیویٹ اور ہر شخص کا ذاتی معاملہ ہے اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دین روزمرہ کی اجتماعی زندگی سے الگ ایک چیز بن کر رہ گیا اور انجام کار پروٹسٹنٹ مذہب صرف اتوار منانے کا نام رہ گیا۔ باقی کا پورا ہفتہ مادی ترقی اور معاشی خوشحالی کے لیے وقف کر دیا گیا۔

یورپین کلچر کی نشاۃ ثانیہ کے ساتھ قرونِ وسطیٰ کے علماء نے بڑے اشتیاق سے اُن سائنسی علوم کی چھان بین کی جو انہیں مسلمان سپین کی یونیورسٹیوں سے ملے تھے۔ مسلمانوں نے صرف افلاطون اور ارسطو کی تحریریں ہی محفوظ نہیں کی تھیں، اور انہوں نے محض یونانی طب اور ریاضی ہی کو بچا کر نہیں رکھا تھا، بلکہ تجربہ گاہوں میں تجربے کر کے ان میں بڑے اضافے بھی کیے تھے۔ گیرڈ (GERARD) نے اپنی ساری زندگی سائنسی علوم پر مشتمل بالوسے کتابوں کا عربی سے ترجمہ کرنے کے لیے وقف کر دی۔ ان کتابوں میں ابن سینا کی "القانون" بھی شامل ہے جو صدیوں تک یورپ کے تمام طبیہ کالجوں میں آخری سند تسلیم کی جاتی رہی ہے۔

بیکن نے "جدید بحر اوقیانوس" میں جدید دور کی سائنسی روح کا خلاصہ پیش کیا ہے۔ برطانوی جہاز ڈوبو بحر الکاہل میں ایک خیالی سرزمین پر لنگر انداز ہوتا ہے۔ اس کا طرۂ امتیاز وہ عظیم الشان ادارہ ہے جو سائنسی تحقیق کے لیے مخصوص ہے۔ وہاں کا فرمانروا جہاز کے مسافروں سے کہتا ہے: "ہمارے ادارے کا مقصد اسباب و علل اور اشیاء کے سربستہ محرکات کا سراغ لگانا ہے اور ہم انسانوں کی فرمانروائی کی حدود میں ہر ممکن چیز لانا چاہتے ہیں۔"

بیکن نے تجرباتی طریقے کی ابتدا کی اور ڈیکارٹ (DESCARTES) نے اسے مزید آگے بڑھایا۔ انہوں نے ارسطو کے اور قرونِ وسطیٰ کے فلسفیوں کے رعب کو بالکل ختم کر دیا۔ ان لوگوں نے پہلے سے معلوم چیزوں کو محض ثابت کرتے رہنے کے بجائے نئے نئے حقائق معلوم کرنے کے راستے نکالے۔ سائنسی تحقیق اور مذہب میں فی الواقع کوئی اصولی جھڑپ نہیں ہے۔ کیا قرآن اور بائیبل دونوں

انسان کو خدا کی وہ بہترین مخلوق تصور نہیں کرتے جس کے تابع باقی تمام مخلوق اور جس کے نفع کے لیے باقی سارے عناصرِ فطرت ہیں ۔ کولمبس سے صدیوں پہلے مسلمان جغرافیہ دانوں کا یہ معلوم کرنا کہ زمین گول ہے اور کاپرنیکس سے کئی سو سال پہلے مسلمان ماہرینِ فلکیات کے یہ اندازے کہ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے اسلامی نظامِ زندگی کے لیے ذرہ برابر خطرہ نہ پیدا کر سکے۔ چونکہ قرآن سکھاتا ہے کہ فطرت انسان کی دوست ہے اس لیے مسلمان سائنسدان اس کے ساتھ ہم آہنگی پیدا کر کے رہتے رہے اور انہوں نے اس کائنات کو ہمیشہ گھر سمجھا۔

جدید سائنس کا المیہ یہ نہیں ہے کہ اس نے اتنی بڑی بڑی ایجادات کی ہیں۔ یہ ایجادات تو نوعِ انسانی کے لیے حد درجہ مفید ثابت ہو سکتی ہیں۔ اصل المیہ خود ان سائنس دانوں کا غیر منطقی اور محدود مادی نقطۂ نظر ہے۔ کاپرنیکس (COPERNICUS) کے بعد مغربی ماہرینِ فلکیات نے دیکھا کہ انسان ایک چھوٹے سے سیارے پر ایک باریک سے نقطہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ پھر یہ گھومتا ہوا سیارہ بغیر کسی مقصد کے ایک لا انتہا سمندر جیسے ایک نظامِ شمسی میں جذب سا ہو جاتا ہے۔ چونکہ خدا، فرشتے اور جن خوردبینوں اور دور بینوں کے ذریعے نظر نہیں آتے تھے اس لیے ان ماہرین نے یہ نتیجہ نکالا کہ اس پیچیدہ سی شمسی مشین میں انسان بالکل اکیلا ہے اور وہ کسی حادثے یا غلطی کی پیداوار ہے مغربی مفکرین نے انسان کو اس کائنات میں اجنبی محسوس کیا۔ انہیں کسی ایسے خدا کا صریح ثبوت نہ ملا جو انسان کی فلاح و بہبود کا انتظام کرتا ہو۔ اس لیے زندگی کے مقصد اور مفہوم کی تلاش و تحقیق کو بے سود قرار دیتے ہوئے انہوں نے فطرت کو اپنا حریف گردانا جسے فتح اور مسخر کر کے اپنی مادی ترقی کے لیے استعمال کرنا چاہیے۔

ڈیکارٹ اور دوسرے مغربی سائنسدانوں کے نزدیک کائنات کی حیثیت بس ایک مشین کی ہے جس کا کوئی اخلاقی و روحانی مقصد نہیں۔ انسان سمیت تمام جاندار چیزیں کیمیائی عمل اور ردِ عمل کا نتیجہ ہیں۔ ڈیکارٹ (DESCARTES) نے تو یہاں تک شیخی بگھار دی کہ مجھے عناصرِ ترکیبی دے دو اور میں تمہیں کائنات بنا دکھاؤں گا۔

نیوٹن نے یہ نظریہ پیش کیا کہ کائنات کچھ ناقابلِ تغیّر اصولوں میں کسی ہوئی ہے۔ اس نظریہ کے نشہ سے مدہوش ہوکر اس نام نہاد منوّر دور کے سرغنہ لوگوں نے یہ تعلیم دی کہ وہ تمام اعتقادات اٹھا پھینکنے کے لائق ہیں جو انسانی تجربہ و مشاہدہ کے خلاف ہوں۔ معجزات، وحی، نبوت اور مذہبی تقریبات و عبادات کا یہ کہہ کر مذاق اڑایا گیا کہ یہ تو توہمات ہیں۔ والٹیر (VOLTAIRE) نے خدا کا تصور قرآن اور بائیبل دونوں سے مختلف پیش کیا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ خدا نے اس کائنات کو بالکل اسی طرح بنایا جس طرح ایک گھڑی ساز گھڑی کے پرزے جمع کرتا اور انہیں ترتیب دیتا ہے اور اس کے بعد گھڑی کے ساتھ اس کا تعلق نہیں رہتا۔ ہیوم (HUME) نے تمام دینی اعتقادات کا اس لیے انکار کیا کہ اس کے نزدیک وہ سائنسی تجربات اور استدلال کے ذریعے ثابت نہیں کیے جا سکتے۔ اس نے والٹیر کے اُس بے جان اور بے کار خدا پر بھی یہ کہہ کر حملہ کیا کہ ہم نے گھڑیاں بنتے ہوئے تو دیکھی ہیں لیکن دنیائیں بنتی نہیں دیکھیں، اس لیے یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ ہم خدا کو مانیں۔ ہیوم (HUME) نے کہا کہ اگر بالفرض کائنات کا کوئی بنانے والا تھا تو ہو سکتا ہے کہ وہ ایک ناکارہ سا کاریگر ہو، ہو سکتا ہے وہ کام ختم کر کے کبھی کا مر چکا ہو، ہو سکتا ہے کہ وہ مرد ہو یا عورت، ہو سکتا ہے کہ وہ ایک سے زیادہ ہوں، یہ بھی ممکن ہے کہ وہ سراسر خیر ہو، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ سراسر شر ہو، اس کا بھی امکان ہے کہ وہ خیر و شر کا مجموعہ ہو، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ کچھ نہ ہو، اور غالباً یہ آخری بات ہی ٹھیک ہے۔ انکارِ آخرت کی دلیل ہیوم (HUME) نے اس طرح دی، وہ زندگی جس میں جزا و سزا انسانی اعمال کے مطابق نہ ہو اس سے ہم یہ نتیجہ نہیں نکال سکتے کہ کوئی اور ایسی زندگی ضرور ہو گی جہاں اس طرح انصاف ہو گا۔

اخلاق کو ریاضی کی طرح ایک سائنس تصور کیا گیا۔ جس طرح انسانی علوم کے دوسرے بے شمار شعبے مذہب سے آزاد ہیں اسی طرح اخلاقیات کا بھی دین سے کوئی تعلق نہ رہنے دیا گیا۔ ڈیڈروٹ (DIDEROT) اور روسو (ROUSSEAU) ایسے فلسفی اس بات پر متفق ہو گئے کہ فائدہ اور مسرت اخلاق کا واحد معیار ہیں۔ انہوں نے پورے عزم کے ساتھ اُن اخلاقی معیاروں کے خلاف جنگ کی جن کی کوئی فوری افادیت اور قدر و قیمت نہیں۔ انہوں نے یہ نظریہ پیش کیا کہ دوسرے انسانوں کے جائز حصّے کو غصب

کیے بغیر ہر قسم کے ذرائع سے ایک آدمی اس زندگی میں جتنی خوشی حاصل کر سکتا ہے اسے کرنی چاہیے۔ جو تعلقات تعلق رکھنے والوں کو مسرت مہیا کریں وہ جس نوعیت کے بھی ہوں، ہر حال میں مفید ہی ہونگے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جنسی تعلقات میں عصمت و عفت کے تقاضوں کو بے سُود اور مہمل گردانا گیا اور صرف وہ خوشیاں جو معاشرے پر فوراً اور براہِ راست بُرا اثر ڈالتی ہوں، انہیں متروک قرار دیا گیا۔ اس نام نہاد عہدِ تہذیب و ترقی کے فلسفی مذہبی آزادی کے علمبردار اس وجہ سے نہیں بنے کہ وہ رواداری کے اصول پر ایمان رکھتے تھے، بلکہ اس کا اصل سبب یہ ہے کہ انہیں مذہب سے کوئی دلچسپی ہی نہ تھی، ورنہ رواداری نام کی کوئی چیز فی الحقیقت ان میں نہیں پائی جاتی۔

جنہیں یہ ماضی کی "احمقانہ غلطیاں" کہتے تھے انہیں نیست و نابود کر کے یہ "روشن خیال" سمجھنے لگے کہ اب یہ سائنس اور عقل کی عالمگیر تعلیم کے ذریعے زمین پر بہشت بنا دیں گے۔ ان کا خیال تھا کہ سائنس وہ "جادو کی چابی" ہے جس کے ذریعے انسان خود اپنی مرضی سے اپنی قسمت بنائے گا آزادی معاشی و معاشرتی مساوات اور عالمگیر امن و چین کا دَور دورہ ہو گا۔ انہیں یقین تھا کہ علم طب کی ترویج و ترقی سے ساری بیماریاں اور مصیبتیں ختم ہو جائیں گی اور انسانی زندگی یہاں لا متناہی ہو جائے گی۔ بعد کی صدی میں سائنسی معلومات کے اندر جو انقلابات آئے ان سے ان لوگوں کا یہ یقین پختہ تر ہو گیا کہ کسی مافوق الفطرت ہستی کی مدد کے بغیر ہی اس زمین پر انسانی زندگی مکمل اور پائیدار ہو جائے گی۔

ڈارون نے یہ نظریہ پیش کیا کہ انسان نے "زندگی" کی ابتدائی شکلوں سے بتدریج ارتقاء کیا ہے۔ اس نظریہ نے اقدار کا پیمانہ ہی یکسر تبدیل کر دیا۔ اب فلسفی یہ سمجھنے لگے کہ انسانی معاشرہ پیہم تغیر کی حالت میں ہے اور یہ تغیر لامحالہ ارتقاء کی اعلیٰ منازل ہی کی طرف جا رہا ہے۔ حیاتیاتی ارتقاء کے اصولوں کو انسانی سوسائٹی پر منطبق کیا گیا تو "جدید"، "ترقی یافتہ" اور "ترقی پذیر" جیسی اصطلاحات اور الفاظ سب سے زیادہ پسندیدہ سمجھے جانے لگے۔ مؤرخین آئے۔ انہوں نے انسان پر فطرت کی تخلیق اور اس کے ایک حصے کی حیثیت سے نظر ڈالی۔ انہوں نے خیال کیا کہ انسان ایک متحارب ماحول کے

خلاف کامیابی سے کشمکش کرتے ہوئے نچلے مدارج سے ترقی کر کے اپنی اس حالت کو پہنچا ہے ڈارون نے مغربی مفکرین کو قائل کر دیا کہ انسان بلاشبہ دوسرے حیوانات سے بلند تر ہوتے ہوئے بھی بس ایک حیوان ہی ہے۔ ولیم جیمز (W. JAMES) نے انسانی شعور یا انسانی ذہن کو ناقابلِ فہم قرار دیتے ہوئے اس تصور پر بھی حملہ کیا۔ اس نے کہا کہ جسے ہم غور و فکر یا سوچ بچار کہتے ہیں اس کی حقیقت اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ وہ اعصابی نظام پر خارجی محرکات کے کیمیائی ردِ عمل کا نتیجہ ہے۔ پاولوف (PAVLOV) کی طرح کے ماہرینِ نفسیات نے انسانی رویے کے محرکات کا اندازہ لگانے کے لیے کتوں اور بندروں کے طرزِ عمل کا مطالعہ شروع کیا۔

فرائڈ (FREUD) نے انکشاف کیا کہ بچپن میں انسان کے لاشعور میں کچھ ایسی چیزیں بیٹھ جاتی ہیں جو بعد میں غیر عقلی رویے کا باعث بنتی ہیں۔ اس انکشاف کو فلسفیوں نے مذہب کے خلاف ایک مزید ہتھیار کے طور پر استعمال کیا۔ فرائڈ نے یہ دعویٰ کیا کہ چونکہ چھوٹے بچے کے ذہن میں یہ بات بیٹھ جاتی ہے کہ اس کے والدین نے اسے زندگی دی اور وہ اسے نقصان سے بچاتے ہیں، اس کے والدین اس کی زندگی کو منضبط کرتے اور اسے سزا یا انعام دیتے ہیں، لہٰذا جب وہ جوان ہوتا ہے تو یہی چیزیں مذہبی اعتقادات کا روپ دھار لیتی ہیں۔ یہ تصور کہ مذہب انسان کی بنائی ہوئی ایک چیز ہے اور اخلاقی قدریں مستقل نہیں بلکہ اضافی ہیں، علم الانسان سے بحث کرنے والوں کے ہاں بڑا مقبول ہوا۔ علم الانسان سے بحث کرنے والے بہت سے لوگ رلیف لنٹن (LINTON) سے اتفاق کرتے ہوئے نظر آئیں گے کہ اسلام کا بے لچک نظریۂ توحید سامی قبائل کے اس تشدد پر مبنی عائلی نظام کی پیداوار ہے، جس میں مردِ خاندان کا مختارِ کل سربراہ ہوتا تھا۔ لنٹن اپنی کتاب "شجرِ تمدن" میں لکھتا ہے:

"ایک ایسے قادرِ مطلق کا تصور جس کے کام خواہ کتنے ہی غیر منصفانہ معلوم ہوں مگر وہ مکمل فرمانبرداری اور وفاداری ہی کے ذریعے خوش کیا جا سکتا ہے، براہِ راست سامی عائلی نظام کی پیداوار تھا۔ اس عائلی نظام نے مبالغہ آمیز مافوق الفطرت انانیت کو جنم

دیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ قانون موسوی کی شکل میں انسانی زندگی اور رویہ کے ہر پہلو کے متعلق محرمات کی ایک مفصل فہرست تیار ہو گئی۔ محرمات کا یہ سلسلہ اُن لوگوں نے گرہ میں باندھ لیا جو بچپن میں اپنے باپ کے احکام کو یاد رکھنے اور احتیاط سے ان پر عمل کرنے کے عادی ہو چکے تھے۔ اللہ تعالیٰ کا تصور مخصوص قسم کے سامی باپ کا پرتو ہے جس کے اختیارات اور اوصاف میں تجرّد اور مبالغہ پیدا کر دیا گیا ہے . . . .“

مذہب کے الہامی ماخذ کے انکار پر فرائڈ (FREUD) مطمئن نہ ہوا تو اس نے سرے سے یہ بات ہی تسلیم کرنے سے انکار کر دیا کہ کسی بنیاد پر بھی مذہبی اعتقادات کے لیے کوئی وجہ جواز نکلتی ہے۔ وہ لکھتا ہے :-

”یہ بات سچی معلوم نہیں ہوتی کہ اس کائنات میں کوئی ایسی طاقت ہے جو ہر فرد کی فلاح و بہبود اور اس کے بہتر انجام کے لیے اس طرح انتظام کرتی ہے جس طرح والدین اپنے بچوں کے لیے احتیاط کرتے ہیں، بلکہ اس کے برعکس آدمیوں کی قسمتیں انصاف کے نام عالمگیر اصولوں سے ٹکرانی ہیں۔ زلزلے، طوفان، سیلاب اور آگ نیک و بد اور مومن و کافر میں کوئی فرق نہیں کرتے۔ اگر ہم باقی کے بے جان فطری حوادث کو چھوڑ دیں اور صرف انسانوں کے باہمی تعلقات ہی پر نظر دوڑائیں تو یہاں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ افراد کی تقدیر میں یہ اصول کسی طرح کارفرما نہیں کہ نیکی کا اچھا بدلہ ملتا ہو اور برائی کی سزا دی جاتی ہو۔ اکثر یُوں ہوتا ہے کہ بدمعاش اور بے اصول لوگ اس دنیا میں عمدہ چیزیں لے جاتے ہیں اور نیک اور پرہیزگار لوگ خالی ہاتھ منہ دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ تاریک، غیر حساس اور ظالم قسم کی قوتیں انسانی مقدر کا فیصلہ کرتی ہیں اور مذہب کے اس تصور کا یہاں وجود ہی نہیں پایا جاتا کہ دنیا میں خدائی انصاف کی حکومت ہے۔ سائنس کی برتری کم کرنے کی کتنی ہی کوشش کیوں نہ کی جاتے، مگر اس امر واقعہ سے انکار ممکن نہیں کہ سائنس خارجی دنیا کے حقائق پر ہمارے انحصار کا اندازہ لگاتی ہے جبکہ

مذہب محض ایک بچکانا تصور ہے جس کو صرف اس چیز سے قوت ملتی ہے کہ یہ انسان کی کچھ جبلّی خواہشات کا ساتھ دیتا ہے۔"

برٹرینڈرسل (BERTRAND RUSSELL) اس مکمل مادی وملحدانہ فلسفہ کو مزید ترقی دیتے ہوئے لکھتا ہے:

"یہ حقیقت ہے کہ انسان اُن علتوں کی پیداوار ہے جن کے پیش نظر کسی مقصد کا حصول نہیں تھا۔ یہ سچ ہے کہ بنی نوع انسان کی پیدائش، اس کا ارتقاء، اس کی توقعات اور حسرات اور اس کی محبتیں اور عقیدے ذرات کے اتفاقی عمل کا نتیجہ ہیں۔ یہ امر واقعہ ہے کہ کوئی اولوالعزمی اور فکر و احساس کی کوئی شدت فرد کی زندگی کو قبر کے بعد قائم اور محفوظ نہیں رکھ سکتی۔ یہ حقیقت ہے کہ قرنہا قرن کی ریاضتیں، ساری وفاداریاں اور انسانی تخلیقات و عبقریت کی تمام نوعیتیں وسیع نظام شمسی میں بس جذب ہو کر رہ جاتی ہیں اور وہ اس کے ساتھ ختم ہو جائیں گی۔ یہ امر مسلم ہے کہ انسانی کارناموں کی ساری فلک بوس عمارتیں لامحالہ کائنات کے کھنڈرات میں دب کر رہ جائیں گی — یہ ساری چیزیں اتنی یقینی اور حتمی ہیں کہ کوئی فلسفہ ان کا انکار کر کے یہاں ٹھہر نہیں سکتا۔ انہی سچائیوں کے دائرہ کے اندر اور اسی غیر متبدل مایوسی کی مستحکم بنیاد پر انسان کا مسکن بحفاظت بنایا جا سکتا ہے۔"

فرائڈ (FREUD) نے دینی عقائد کو کوئی مثبت قدر و قیمت دینے سے انکار کر دیا مگر اسے یہ تسلیم کرنا پڑا کہ سائنس مذہب کا کوئی اطمینان بخش متبادل نہیں ہے۔ وہ کہتا ہے:

"اس میں شک نہیں کہ سائنس نے حقیقی دنیا پر زور دیا ہے مگر یہ بھی ناقابل تردید حقیقت ہے کہ اس کی خصوصیات بھی منفی نوعیت کی ہیں۔ سائنس نے اپنے آپ کو محسوس مادی حقائق تک محدود کر لیا ہے اور خیالات و احساسات سے اسے کوئی سروکار نہیں۔ ہمارے وہ دوست جو اس صورتِ حالات سے مطمئن نہیں ہیں اور وہ اپنی ذہنی تسکین کے لیے کسی اور چیز کی طلب

رکھتے ہیں، وہ اس چیز کو جہاں پاسکتے ہیں پالیں، ہم بہر حال اس سلسلے میں ان کی کوئی مدد نہیں کرسکتے۔"

شوپن ہاور (SCHOPEN HAUER) نے اس خالص مادی فلسفہ کو اس کے منطقی نتائج تک پہنچا کے چھوڑا۔ اس کے نزدیک اس زندگی کے جوہر و ماحصل کا کوئی مقصد نہیں۔ وہ سمجھتا ہے کہ حیات محض ایک بے معنی حرکت اور خالصتہً ایک غیر معقول قوت کا نام ہے۔ وہ لکھتا ہے :۔

"چونکہ انسان کی تمام خواہشات کی بنیاد ضرورت، قلت اور تکلیف ہے اس لیے درحقیقت بنیادی طور پر درندے اور انسان کی فطرت ایک ہی ہے اور اسی فطرت کا سَت۔ دکھ درد اور تکلیف ہے پھر یہ بھی امر واقعہ ہے کہ اگر انسان کی خواہشات ختم کردی جائیں تو اس کا دل کچھ اتنا بیزار سا ہو جاتا ہے کہ خود زندگی اس کے لیے ناقابل برداشت بوجھ بن جاتی ہے پس یوں سمجھیے کہ زندگی ایک لٹکن (PENDULUM) ہے جو تکلیف سے بیزاری کی طرف اور بیزاری سے تکلیف کی طرف پیہم حرکت کرتا رہتا ہے۔ زندگی چٹانوں اور بھنوروں سے بھر پور سمندر ہے۔ انسان بڑی احتیاط اور ہوشیاری کے ساتھ ان خطرات سے جان بچاتا ہوا چلتا ہے مگر پھر بھی ان تمام کوششوں اور اس ساری مہارت کے باوجود ہوتا یہی ہے کہ وہ ہر ہر قدم اور ہر ہر لحظہ اس سب سے بڑی اور ناگزیر تباہی کی طرف بڑھتا چلا جاتا ہے جسے موت کہتے ہیں۔۔"

یہ ہم نے تحریک احیاءِ علوم کے دور سے شروع ہونے والے مغربی مادہ پرستانہ فلسفہ کے مآخذ کا کھوج لگایا ہے۔ تحریکِ احیاءِ علوم کے زمانے میں لوگ اپنی ذہنی تسکین کی خاطر اپنے اردگرد پھیلی ہوئی وسیع کائنات کے متعلق معلومات حاصل کرتے رہتے تھے، مگر بغیر بریک اور رہنما کے چلی ہوئی اس گاڑی کی آخری منزل شوپن ہار (SCHOPEN HAUER) کی وہ قنوطیت ہے جسے اس زندگی میں سوائے بے مقصد تباہی کے کچھ نظر ہی نہیں آتا۔ ہم نے دیکھا ہے

کہ ایک زمانے میں انسان اس زمین پر خدا کا خلیفہ سمجھا جاتا تھا۔ اس کی روح غیر فانی خیال کی جاتی تھی اور اس کے متعلق یہ تصور پایا جاتا تھا کہ وہ ایک اخلاقی و روحانی وجود ہے جو براہِ راست اپنے خالق کے سامنے جوابدہ ہے۔ پھر ہم نے یہ گراوٹ بھی دیکھ لی کہ انسان کو محض ایک جانور سمجھا جانے لگا جس کا مقصد اپنی جسمانی اور معاشرتی ضروریات پوری کرنے کے سوا کچھ نہیں۔

مادہ پرستانہ فلسفہ کا یہ فکری پس منظر ذہن میں ہو تو یہ دیکھ کر کوئی تعجب نہیں ہوتا کہ اس روئے زمین پر فاشزم، نازی ازم، کمیونزم، افادیت پرستی اور صیہونیت جیسے نظریات اور نصب العین اس بے تکلفی اور فراوانی کے ساتھ پھل پھول رہے ہیں۔ وسیع پیمانے پر قتل عام کے انتظام کرنے والے نازی رہنما، اشتراکی روس کی خفیہ پولیس، اشتراکی چین میں عام انسانوں کی زندگیوں کو شکنجوں میں کس دینے والے قائد، اور پوری ایک قوم کو ان کے گھروں سے نکال دینے والے صیہونی لیڈر، ان سب کو نطشے (NITZSCHE) کے اس نظریہ سے تقویت ملی ہے کہ خدا مر چکا ہے۔

اپنی بے پناہ معاشی اور سیاسی قوت کے بل بوتے پر مغربی تہذیب پوری دنیا پر اپنا تسلط جمانے میں کامیاب ہو گئی۔ اس کے بعد جب ایشیائی اور افریقی قومیں نوآبادیاتی نظام سے سیاسی آزادی حاصل کرنے میں کامیاب ہوئیں تو اس وقت تک ان کی مقامی تہذیبیں اور ثقافتیں پوری طرح سے کچلی جا چکی تھیں۔ ان قوموں کے تقریباً بلا استثنا سارے رہنما یورپین اور امریکی یونیورسٹیوں کے فارغ التحصیل تھے۔ وہ اپنی قومی تہذیب کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ وہ مغربی مادیت کے فلسفہ سے مرعوب اور اس کے نشہ سے سرشار تھے۔ اسی صورت حالات کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ایشیا اور افریقہ کے موجودہ قائدین یورپ اور امریکہ کے رہنماؤں کے ساتھ اس فکر میں پوری طرح ہم آہنگ ہیں کہ بھاری صنعتوں کو ترقی دینا، زندگی کا مادی معیار بڑھانا، اور معاشی و سیاسی قوت کو وسعت دینا ہی انسانی معاشرہ کا سب سے اونچا اور اعلیٰ مقصد ہے

ہمیں اسلام کو مغربی فلسفہ کے ساتھ خلط ملط نہیں کرنا چاہیے۔ اسلام سماجی اور معاشی بے انصافیوں کی بیخ کنی کے لیے اپنا الگ طریق کار رکھتا ہے۔ اسلامی نقطۂ نظر سے مادی بہبود کا بس کم سے کم اتنا معیار ضروری ہے کہ جس کے ہوتے ہوئے انسان دلجمعی کے ساتھ اپنے اخلاقی و روحانی تقاضے پورے کر سکے۔ مغربی فلسفہ کے برعکس اسلام میں مادی خوشحالی بذاتِ خود مقصد نہیں بلکہ مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے۔

اس مادہ پرستانہ پس منظر میں دیکھیں تو اس میں تعجب کی قطعاً کوئی بات نہیں رہ جاتی کہ افریقہ اور ایشیا کے لیڈروں کے لیے مغربی آمریت کی مختلف شکلیں اتنی پُرکشش کیوں ہیں۔ اور وہ مغرب کے سماجی، سیاسی اور معاشی نظام اپنانے کے لیے حد درجہ بیتاب کس لیے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ اشتراکی چین کی روز افزوں طاقت کو دیکھ کر عش عش کریں گے، مگر یہ کبھی نہ دیکھیں گے کہ اپنی اس سیاسی اور معاشی برتری کے لیے چین نے کتنے ملین انسان موت کے گھاٹ اتارے۔ ان رہنماؤں کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ مقصد حاصل ہونا چاہیے۔ ذریعہ خواہ کچھ ہو۔

ہو سکتا ہے کوئی یہ سوچے کہ مغربی تہذیب کے اس پھیلاؤ سے دنیا میں تمدنی تنوع ختم ہو جائے گا اور اس کے نتیجے میں قوموں میں زیادہ اتحاد اور یگانگت پیدا ہو گی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس طرح کی سوچ خواب سے زیادہ کچھ نہیں۔ یہ امر واقعہ ہے کہ آج سے پہلے دنیا کی مختلف قوموں کے درمیان کبھی اتنی نفرت، کشمکش، چپقلش اور اکھاڑ پچھاڑ نہیں ہوئی جتنی آج ہے۔ اس کا بالکل واضح سبب یہ ہے کہ مغربی تہذیب کی اٹھان ہی روحانی و اخلاقی قدروں سے بغاوت پر ہوئی ہے۔ جس کا فطری نتیجہ یہ نکلا ہے کہ بین الاقوامی تعلقات میں بھی اخلاقی ذمہ داری کا کوئی شعور نہیں پایا جاتا۔ اقوامِ متحدہ کے اجلاسوں میں مندوبین جھوٹ بولنے اور حسبِ ضرورت حقائق کو توڑ مروڑ کر پیش کرنے میں ذرہ برابر جھجک محسوس نہیں کرتے۔ دوسرے ملکوں اور قوموں کا کتنا ہی نقصان ہو جائے لیکن جو چیز ان کی اپنی قوم کے لیے نفع بخش ہے وہ کبھی غلط نہیں ہو سکتی۔ اقوامِ متحدہ کے مختلف مسائل پر نمائندے حق کو نہیں بلکہ مصلحت کے پیشِ نظر ووٹ دیتے ہیں۔ نتائج

اس صورتِ حالات میں یہ کیونکر توقع کی جا سکتی ہے کہ مغربی تہذیب کے پھیلنے سے دنیا میں اتحاد بڑھے گا؟

یہ ہے مغربی تہذیب کی اصلیت اور یہ ہیں اس کے اثرات اور سچی بات یہ ہے کہ اس سلسلے میں مسلم دنیا کے رہنما کسی اور سے کم خطا کار نہیں۔ وہ بھی مغربی مادہ پرستانہ فلسفوں سے دھوکہ کھائے ہوئے ہیں۔ ان میں سے کچھ بڑی چکنی چپڑی باتیں کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اس وقت اسلام کو دورِ جدید کے تقاضوں کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کی سخت ضرورت ہے۔ اس مشکل کو حل کرنے کے لیے وہ یہ تجویز کرتے ہیں کہ قرآن کی روحانی تعلیم اور اس کے معاشرتی نظام کو الگ الگ کر دیا جائے۔ ان کے نزدیک قرآن کا سماجی نظام ساتویں صدی عیسوی کے عرب کے حالات کا پرتو ہے جو اس نئے زمانے میں ناقابلِ عمل ہونے کی وجہ سے متروک قرار دے دینا چاہیے اور بس قرآن کی روحانی تعلیم کو ابدی سچائی سمجھ کر قبول کر لینا چاہیے۔ ان لوگوں کو اس حقیقت کا علم ہی نہیں کہ اسلام ایک مکمل نظامِ زندگی ہے جو مغرب کے تمام افکار، اور نظام ہائے حیات سے کہیں زیادہ برتر ہے۔ وہ یہ جانتے ہی نہیں کہ اس نظام میں سے اگر کچھ لے لیا جائے اور کچھ چھوڑ دیا جائے تو سارا سسٹم تباہ ہو جاتا ہے۔ مسلمان دنیا کے رہنماؤں کو ٹھنڈے دل سے سوچ کر یا پورا مغربی مادہ پرستانہ فلسفہ قبول کر لینا چاہیے یا پورا اسلام۔ وہ دونوں کو ایک ساتھ لے کر نہیں چل سکتے۔

جماعت اسلامی جموں و کشمیر کے آرگن

ماہنامہ "اذان"

سے روزمرہ مسائلِ زندگی پر اسلامی مضامین کے علاوہ ریاست میں تحریکِ اقامت دین کی رفتار سے بھی واقفیت حاصل کیجیے ۔ سالانہ چندہ چار روپے ۔ فی پرچہ ۳۷ نئے پیسے

مینیجر ماہنامہ اذان، بازار سرینگر، کشمیر